

تعارف کتب

عبدالحمید صدیقی

چند سال پیشتر ترجمان القرآن میں تعارف کتب کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کو بعض احباب نے پسند فرمایا۔ لیکن چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر یہ جاری نہ رکھا جاسکا۔ اب اسے از سر نو شروع کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ کسی افادیت کا حامل ہو۔

برٹنڈر رسل BERTRAND RUSSEL

THE NEW HOPES FOR
THE CHANGING WORLD.

رسل کے علمی مرتبہ سے دنیا کا ہر لکھا پڑھا شخص واقف ہے۔ ان کی فلسفیانہ تصنیفات علمی حلقوں سے توجہ حاصل کر چکی ہیں۔ چند سال پیشتر انہیں علمی دنیا کے سب سے بڑے اعزاز یعنی ویل پرائز سے نوازا گیا۔ صاحب موصوف کے انداز فکر میں تدبیراً ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی جاتی ہے۔ ان کی اولین تالیفات میں ”زمینی بازیگری“ زیادہ تھی۔ وہ اس دنیا کی نہیں بلکہ کسی دوسری دنیا کی باتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ بڑھاپا ان پر پوری طرح مسلط ہو گیا ہے تو انہوں نے اس عالم فانی کی حقیقتوں کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ اس لیے ان کے افکار میں اب ”ارضیت“ نسبتاً زیادہ محسوس کی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب ان کی وہ ریڈیائی تقریریں ہیں جو انہوں نے ”سالنامی عہد کی زندگی“ کے عنوان سے نشر کی تھیں۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں جنہیں بارہ ابواب پر بھیلایا گیا ہے۔

ہر وہ شخص جس نے حیات انسانی کا انداز گہرائی میں آن کر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ ہر انسان اس زندگی میں تین مختلف محاذوں پر لڑ رہا ہے۔ ایک طرف وہ قدرت اور اس کی جبریت و قہرانیت کے خلاف صف آرا ہے اور دوسرے محاذ پر وہ کسی طرح وہ اس کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ اس کی ساری تاریخ اسی کوشش کی طویل گمراہی و گمراہی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنی نوع کے افراد کے خلاف جنگ آزما ہے اور تیسرے اس کا اپنا وجود بھی ایک رزم گاہ بنی ہوئی ہے۔ اس کے اپنے احساسات و جذبات، اور انکار و نظریات آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ پہلی لڑائی کے لیے اسلحہ سائنس مہیا کرتی ہے، دوسری

کے لیے سیاست و معیشت اور تیسری کے لیے مذہب اور نفسیات۔ انسانیت کے بقا اور نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ”سہ مکھی کشمش“ کو پوری طرح سمجھے کی کوشش کرے اور اب نئے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ان تین مختلف میدانوں میں اترے۔ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئی تو وہ زندہ رہ سکے گی ورنہ وہ خود بخود نیست و نابود ہو جائیگی۔

سب سے پہلے رسل عہد حاضر کی پیچیدگیوں کا نقشہ بڑی خوبصورتی سے کھینچنا ہے۔ آپ خدا اسے ملاحظہ فرمائیں

”ہم اپنے آپ کو ایک ایسی جنگ کی طرف ناگزیر طور پر بڑھتے ہوئے پاتے ہیں جس کے متعلق ہم سے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ہیں تباہ و برباد کر دیگی لیکن ہماری حالت اس سرگوش کی سی ہے جسے سانپ نے سمجھ کر رکھا ہو۔ وہ خطرے کو بھانپتا تو ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس سے کس طرح بچا جائے ہم ایک دوسرے کو سلامتی اور ہلڈ روجن لمبوں کی خوفناک کہانیاں سناتے ہیں، ہم جگہ جگہ اڑے ہوئے شہروں، روسی حملوں، تھپا اور ظلم و تعدی کے تذکرے کرتے ہیں۔ ہماری عقل ان ہلاکت خیز لوہے کے نام بھی کانپ اٹھتی ہے لیکن اسی عقل کا ایک شعبہ ایسا بھی ہے جو ان میں لذت محسوس کرتا ہے اس لیے ہم میں وہ مضبوط قوت ارادی پیدا نہیں ہونے پاتی جس سے کام لے کر ہم اس بد نصیبی سے نجات حاصل کریں۔ ہماری روح دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ عقلمندانہ ہے اور دوسرا غیر عقلمندانہ جب حالات معمول پر ہوں تو غیر عقلمندانہ حصہ دن بھر سوتا ہے اور صرف رات کو بیدار ہوتا ہے لیکن اس وقت جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں یہ غیر عقلمندانہ حصہ دن کے وقت بھی اکثر جگاؤ رہتا رہتا رہتا ہے اور ہماری فکری صلاحیتوں کو مضمحل کر دیتا ہے۔ ہماری زندگی مفروضات کی نہایت ہی نازک سرحدوں پر کھڑی ہے۔ اکثریت کے لیے یہ طرز حیات از حد تکلیف دہ ہے۔ ایک نوجوان جو تعلیم سے اٹا گیا ہے اپنے آپ کو یہ کہہ لیتی دیتا ہے ”گھبرانے کی کیا بات ہے زندگی کا جلد ہی کسی میدان جنگ میں خاتمہ ہو جائے گا“ وہ خاتون جوانی تیسری قوتوں کو ہرنے کا رلا کر بہتر کام سر انجام دے سکتی ہے یہ سوچتی ہے کہ کیوں نہ عیش کی بجائے پیشتر اس کے کوڑھی سپاہ اُس پر مجرمانہ حملہ کر کے اُس کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ والدین اس سوچ میں ڈوبے

ہوئے ہیں کہ کیا وہ ساری قربانیاں جو وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے کر رہے ہیں وہ ارگٹا
تو نہیں جاؤں گی۔ وہ لوگ جن کے پاس سرمایہ ہے وہ اسے عیش و عشرت پر لگا رہے ہیں کیونکہ
وہ اپنے سامنے اپنا انجام بد دیکھ رہے ہیں۔“

زندگی کا یہ طرز فکر نہایت ہی غلط اور غیر مستندانہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان پر کبھی
کبھی حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر یا اس وقت طبیعت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں۔ اور وہ زندگی کے ہنگاموں
سے منہ موڑ کر کچھ دیر کے لیے حیرت زدہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے لیکن یہ اُس شخص کی منتقل کیفیت نہیں
ہوتی۔ یہ حالت محض عارضی ہے جو کچھ دیر کے بعد یقین و عمل سے بدل جاتی ہے۔ دور جدید کی مایوسی
اس قسم کی دل شکنگی نہیں بلکہ یہ بے یقینی ہے۔ ایک ایسی بے یقینی جو موت کا پیغام ہے، جو نہ صرف
انسان کی فکر و عمل کی صلاحیتوں کو یکسر مفلوج کر دیتی ہے بلکہ بسا اوقات خودکشی پر منتج ہوتی ہے۔ اس
سے ہر مومنانہ انسان کو بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بقول رسل ”دور جدید کی قومیں گرفتار ہیں۔ ان کے ذہنی
افق پر گہرا دھند کا چھارہا ہے وہ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف بڑی سرعت سے بڑھ رہی ہیں اور
گمان یہ کرتی ہیں کہ وہ اس کو دور چھوڑ رہی ہیں۔“

جن لوگوں پر بے یقینی غالب نہیں وہ بد قسمتی سے ایسے نظریات کو اپنا چکے ہیں جو انسانیت کے
لیے سخت مہلک ہیں۔ مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ دنیا میں حکمرانی اور فرمانروائی کا حق صرف گورے اور
خصوصاً آریں نسل کے لوگوں کو ہے، کسی طرح بھی دنیا میں امن و امان کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ رسل اسی
موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”ہماری زندگی کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ وہ لوگ جو یقین کی نعمت سے مالا مال ہیں
وہ عقل و خود سے محروم ہیں اور جو لوگ کچھ بھی غور و فکر کی نعمتیں رکھتے ہیں اُن کے دل دماغ پر تنوک
و شبہات کا قبضہ ہے۔“

اس ابتدائی گفتگو کے بعد فاضل مصنف اصل کشمکش کی طرف آتا ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے
سب سے پہلے تسخیر فطرت کا ذکر کیا ہے۔ انسان نے آج تک ایجادات و اکتشافات میں جو حیرت انگیز

ترقی کی ہے، اُس کی داستان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے انسانیت کی راہ میں کچھ سنگ گراں ڈال رکھے ہیں۔ ان کی غرض دعاوت یہ نہیں کہ انسان کو آگے بڑھنے سے روک دیا جائے بلکہ ان کا مقصد انسانیت کو دعوتِ فکر و عمل دینا ہے تاکہ وہ اپنے دل و دماغ کی قوتوں سے کام لے کر انہیں اپنے راستے سے ہٹا دے۔ یہ زمان و مکان کی حد بندیوں جنہوں نے انسانی زندگی کو مجبور اور بوجھل بنا دیا ہے یہی دراصل انسان کی ترقی و ارتقاء کی ضامن ہیں۔ انہیں پر مجبور حاصل کرنے کے لیے انسان نے جدوجہدِ شرف کی اور اس کے نتیجے میں اسے فطرت کے لانا خدا و داد ہائے سرسبز معلوم ہوئے۔ یہ سب رفتار سواریاں اور ہوا کے توج کو نامہ و پیغام کا ایلچی بنانے کے جو مختلف طریقے وضع کیے گئے یہ سب انہیں رکاوٹوں کے چیلنج کا کامیاب جواب ہیں یہیں اس حصہ سے کہنی حد تک اتفاق ہے لیکن جہاں ایک مسلمان کا راستہ عیاں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تسخیرِ فطرت کو ایک انسان اپنی حماقت سے تسخیرِ خدا سمجھ لے۔ قدرت کے یہ مختلف مظاہر بھی خالقِ کائنات کی اُسی طرح مخلوق میں جس طرح انسان۔ اُن کو اپنے قابو میں لیکر ان سے فائدے اٹھانے کو جو لوگ خدا پر انسان کی فتح خیال کرتے ہیں، اُن کی عقل پر نام نہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان مظاہر کے بارے میں غور و فکر کا فطری نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ آدمی ان کے بنانے والے، ان کے انتظام و انصرام کرنے والے کی عظمت کا اندازہ لگائے لیکن اگر کوئی ان پر غور کرے کہ ان کے خالق کے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے تو اسے اس کی کج فہمی کے علاوہ اور کس چیز پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

پھر اس قسم کے لوگوں کی ایک اور منطق ٹبری دلچسپ ہے۔ یہ حضرات یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ جو چیز ان کی عقل کی زد میں آجائے وہ خود بخود معدوم ہو جاتی ہے گویا کسی چیز کا اُن کی عقل کی گرفت میں آنا ہی اُن کے وجود کی نفی کر دیتا ہے۔ یہ لوگ ذاتِ باری تعالیٰ کو ایک عظیم ہوشور با خیال کرتے ہیں کہ جب تک وہ ان لوگوں کی نزدیکی حسرتِ باہر ہے تو اُس کا وجود یقینی ہے لیکن جب اُن کی عقل اس کی گہ میں کھول دینے میں کامیاب ہو جائے تو اُس کا وجود بھی تحلیل ہو جاتا ہے چنانچہ ان لوگوں نے خدا کے متعلق جو غور و فکر کیا ہے اُس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان جب اس عجیب غارِ قدرت میں آتا گیا تو وہ مہریت ہو کر بہت سی چیزوں کو خدا سمجھ بیٹھا پھر اُس کی عقل نے جوں جوں قدرت کے ان عجائبات کو سمجھنا شروع کیا تو خدا اُس کی تعداد بھی گھٹتی چلی گئی اور بالآخر وہ ایک خدا کو ماننے لگا اور اب جب انسان نے قدرت کو پوری طرح سمجھ دیا ہے تو خدا کا وجود بھی غنقا ہو گیا ہے۔ رسل کی اس بحث میں ایک عجیب و غریب تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ رسل

کا قائل ہے کہ انسانی زندگی کی خوشحالی تسخیر فطرت سے وابستہ ہے مگر دوسری طرف وہ اس بات کا رد کرتا ہے کہ غربی اقوام مشرقی اقوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے جو کوششیں کر رہی ہیں وہ اُن کی سرعت بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے یکسر ضائع جا رہی ہیں۔ یہ طرز استدلال رسل کے اپنے خیال سے بھی متضاد ہے کیونکہ آبادی کا روکنا انسان کی فطرت کے سامنے شکست کی علامت ہے یا فتح کا نشان؟ یہ تو اعلان بیچارگی اور محدودی ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان فطرت کے حملوں کی تاب نہ لا کر خود اپنے گھر والوں پر ہی حملہ آور ہو گیا ہے تاکہ انہیں فطرت کے ہاتھوں قتل کر دینے کی بجائے اپنے ہاتھ سے قتل کر دے۔ پھر رسل صاحب کو اس معاملہ پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی امداد فی الواقع ہماری ہی بہتری اور بھلائی کے لیے کی جاتی ہے یا اس کے پس پردہ کچھ استعماری عزائم بھی کام کر رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ ایشیائی ممالک کو اقتصادی امداد دے رہا ہے۔ لیکن اس امداد کا بیشتر حصہ ان ممالک کو فروغ منظم کرنے پر مجبوراً صرف کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اس ”سماوت“ کو اس طریق سے مختلف ممالک میں خرچ کر دیا جاتا ہے جس سے غیر ملکی استعمار کے ہاتھ مضبوط ہوتا ہے۔ انسان اور انسان کے تصادم کے تحت رسل قومیت پرستی کی مذمت کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ جذبہ انسانیت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب جبکہ پوری دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ ان حالات میں یہ سمجھنا کہ جارحانہ قوم پرستی کا نظریہ اپنا کوئی قوم دنیا میں زندہ رہ سکتی ہے، سخت بیوقوفی ہے۔ اب ہمیں اپنے فکر و نظر کو بدلتا چاہیے اور اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ انسانیت کو قومی اور نسلی تعصبات کی تاریکیوں سے نکال کر ایک ایسے مقام پر لے آئیں، جہاں وہ انسانیت کے نقطہ نظر سے غور کر سکے۔